R. No. 2186/57 | Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷ - شمارہ ۹ | ایڈیٹر آل احمد سرور | یکم مارچ ۱۹۶۸ء

اداریہ

انجمن کی شاخوں کے انتخابات اور بعض عملی کام

انجمن کی کئی ریاستی شاخوں نے نئے قواعد کے مطابق اپنے انتخابات مکمل کر لیے ہیں، مگر ابھی تک ایسی شاخوں کی تعداد خاصی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکیں۔ مجلس عاملہ نے اپنے ۲۷ فروری ۱۹۶۸ء کے جلسے میں ان شاخوں کو آخر مارچ تک اپنے انتخابات مکمل کر لینے کی ہدایت کی ہے۔

انجمن کے نئے قواعد شاخوں کے نمائندوں کے مشورے سے بنائے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ریاستی شاخوں کو ان پر عمل کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہو، مگر چونکہ یہ اب دستور کا جز بن گئے ہیں، اس لیے دستور میں ترمیم کے بغیر ان سے انحراف نہیں ہو سکتا۔ چونکہ انجمن کو عوامی بنیاد دینا ان قواعد کا مقصد تھا، اس لیے ممبری کی فیس پچیس پیسے رکھی گئی تھی۔ ممبری کے لیے چونکہ صرف اردو کا ہمدرد ہونا کافی ہے، اس لیے خیال تھا کہ اس طرح ایک بڑی تعداد ممبر ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ کوشش کی جاتی تو ناکامی کا کوئی سوال نہ ہوتا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے شہروں میں مقامی شاخیں بنانا مشکل تھا، وہاں بڑے ضلعوں میں کم سے کم دو سو ممبروں کی شاخیں بن جانا کسی طرح دشوار نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح پانچ ضلعی شاخوں پر مشتمل ریاستی شاخ وجود میں آ سکتی تھی جس کے پیچھے کم سے کم ایک ہزار ممبروں کی طاقت ہو۔ چونکہ بعض ریاستی شاخوں میں اس سے زیادہ ممبر ہیں، اس لیے یہاں بھی دشواری نہیں ہے، ہاں اپنے پرانے طریقۂ کار کو تھوڑا سا بدلنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ ریاستی شاخیں ۳۱ مارچ تک یہ مرحلے کر لیں گی کیونکہ اس کے بغیر انجمن کی شاخوں کی تنظیم کا نقشہ مکمل نہ ہو سکے گا۔

شاخوں کی تنظیم کا مسئلہ کئی وجوہ سے اہم ہے۔ اگر اردو زبان کی حفاظت کرنی ہے، اگر اس کی تعلیم کا ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ منزل پر انتظام کرنا ہے، اگر سرکاری کاموں اور عوام کی ضرورت کے کاموں میں اس کے چلن کا تحفظ کرنا ہے تو مقامی اور ضلعی اور ریاستی شاخوں کے ایک جال کے بغیر یہ کام ناممکن ہے۔ مقامی سطح پر اچھی تنظیم کے بغیر کوئی مہم نہیں چلائی جا سکتی۔ اس وقت اردو دوستوں کو ہنگامہ پسندی یا سستی سیاست سے بچ کر تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ انھیں سب سے پہلے اپنے پر اور اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اپنی ریاست کے دوسرے باشندوں کو ساتھ لے کر حکومت سے اپنے مطالبات منوانے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مطالبات کے منوانے کے لیے اخلاقی طاقت اور تعداد کی طاقت دونوں کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کی کشش کی وجہ سے لوگ تعمیری کاموں کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے۔ اردو والوں میں خلوص کی کمی نہیں ہے۔ ان میں احتجاج کی طاقت بھی ہے مگر خلوص اور احتجاج کافی نہیں، عمل کی بھی ضرورت ہے۔ عمل کے معنی صرف بڑے پیمانے پر مظاہرے کرنے، بھوک ہڑتال کرنے یا کاروبار بند کرانے کے نہیں، عمل، اداروں کی تعمیر، مرکزوں کے قیام، کاروباری جلسوں کے انعقاد، اعداد و شمار کی فراہمی، دوسرے لوگوں کو ہم خیال بنانے سے بھی عبارت ہے۔ اس لیے اردو دوستوں کو ایسے بڑے جلسوں اور کانفرنسوں کی چنداں ضرورت نہیں جن میں جوشیلی تقریریں ہوں اور شاندار قرار دادیں پاس کی جائیں۔ انھیں ایسے کاروباری جلسوں کی ضرورت ہے جن میں کارکن اپنے تجربے کی روشنی میں قابل حصول اور پروگرام بنائیں۔ اردو دوستوں کو احتجاجی یا ہنگامہ پسند یا اقتدار پرست سیاست سے اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا اپنے اپنے حلقے میں خود ادارے قائم کرنے، انھیں چلانے اور اپنے جمہوری حقوق کے لیے اپنے علاقے کے معقول اور انصاف پسند اشخاص کا تعاون حاصل کرنے سے فائدہ ہوگا۔ ایسے کاموں کے لیے تنظیم کی بہت ضرورت ہے۔ ہماری بیشتر انجمنیں ادبی انجمنیں ہیں۔ وہ مشاعرے کرنے، مقالے پڑھنے اور ادیبوں کی یادگار منانے میں زیادہ وقت صرف کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے کام بھی مفید ہیں، مگر یہ نہ ہونا چاہیے کہ اردو کی خدمت کے معنی صرف اس قسم کے ادبی کام کرنے کے سمجھے جائیں۔ یہ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں، مگر ان سے زیادہ ضروری کام اس وقت ایسے کارکنوں کو یکجا کرنا ہے جو اسکول چلا سکیں، چندہ جمع

کر سکیں، شکایات، اعداد و شمار اور حوالوں کے ساتھ حکومت اور عوام تک پہنچا سکیں، اردو کے کتب خانے اور ریڈنگ روم قائم کر سکیں، اردو کے اچھے اخبار، اچھے رسالے نکال سکیں اور اچھی کتابوں کی اشاعت کے لیے وسائل مہیا کر سکیں۔ ہم لوگ حکومت کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں، بہت سے کام ایسے ہیں جو ہم خود کر سکتے ہیں اور کوئی ہمیں ان سے نہیں روک سکتا۔ حکومت سے اپنی بات پر زور طریقے سے ضرور کہنی چاہیے کیونکہ حکومت پر ہمارا حق ہے اور وہ ہمارے ٹیکسوں کے ذریعہ سے چلتی ہے۔ مگر حکومت پر بہت زیادہ تکیہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ حکومت کے اپنے کام جس طرح چل رہے ہیں ان سے اس کی صلاحیت کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ دراصل آج بھی حکومت کے تعلیمی اداروں سے بہت سے پرائیویٹ ادارے بہتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے پیچھے حکومت کی طاقت نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم کارکنوں کا خلوص، ان کی محنت اور ان کی صلاحیت ہے۔ ایسے پرائیویٹ ادارے ہمیں بھی قائم کرنے ہیں۔ اردو اسکول اس معیار کو آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں جو پبلک اداروں یا کرسچین اداروں کا ہے، اور ان کے برابر نہ سہی مگر اپنے حلقے میں چندے سے اچھا خاصا مالی سرمایہ بھی جمع کر سکتے ہیں۔ دینی تعلیمی بورڈ والوں نے یو۔ پی میں اور انجمن اسلام نے بمبئی میں ایسا کیا بھی ہے۔ یہی تمام اردو دوستوں کو تجربے پیمانے پر سارے ہندوستان میں کرنا ہے۔ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے، ہمیں یقین ہے کہ اس تجربے سے اردو دوست ہر طرح نفع میں رہیں گے۔

خونِ معصوم

علی احمد فاروقی

جسم آزاد ہے، پر ذہن تو اب بھی ہے غلام
نفرتیں آج بھی ہیں دل کے سیہ خانوں میں
مٹ گیا ہند سے تہذیب و تمدن کا نشان
بستیاں ڈھل گئیں سنسان بیابانوں میں

لے کے نفرت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا اثر
ذہن پہ چھائی ہوئی فرقہ پرستی ہے آج
گوتم و گاندھی و نہرو کی مقدس دھرتی
امن و انصاف کی صورت کو ترستی ہے آج

فرقہ وارانہ فضا، ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ
دعوتیں تم نہ دو، یوں ملک کی بربادی کو
رقص کرتی ہوئی مذہب کی سنہری ناگن
پھر کہیں چھین نہ لے ہند کی آزادی کو

خونِ ناحق میں رنگے ہاتھ چھپاؤ گے کہاں؟
شرم آتی نہیں کہتے ہوئے انسان ہیں ہم!
لوٹ لی رنگِ چمن، بوئے چمن، جوشِ بہار
پھر بھی کہتے ہو کہ گلشن کے نگہبان ہیں ہم

خونِ معصوم میں ڈوبی ہوئی اردو کی صدا
اب کبھی ظلم کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی
قتل و خوں، جور و ستم، جبر و تشدد سے کبھی
حق پرستوں کی یہ تحریک نہیں رک سکتی

مرکزی انجمن کی مجلس عاملہ کے فیصلے

مجلس عاملہ نے ۱۰ر فروری کے جلسے میں جو چند اہم فیصلے کیے وہ یہ ہیں:-

(۱) نئی دہلی میں انجمن کی عمارت کا نام اردو گھر ہوگا۔

(۲) جناب سری نواس لاہوٹی کثرتِ رائے سے مجلس عام کے ممبر منتخب کیے گئے۔

(۳) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو صدر انجمن نے مجلس عام کا ممبر نامزد کیا ہے۔

(۴) اپریل میں مجلس عام کے سالانہ جلسے کے موقع پر ریاستی شاخوں کے نمائندوں کا ایک مشاورتی جلسہ ہوگا جس میں انجمن کی آئندہ کانفرنس اور انجمن کے لائحہ عمل پر غور ہوگا۔

(۵) ریاستی شاخوں کو نئے قواعد کے مطابق انتخابات مکمل کرنے کے لیے ۳۱ر مارچ ۱۹۶۸ء تک کی توسیع دی گئی ہے۔

(۶) انجمن کی عمارت کا سنگ بنیاد شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہندوستان نے رکھنا منظور کر لیا ہے۔ تاریخ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔

(آل احمد سرور جنرل سکریٹری)

اردو اساتذہ کی تیسری کانفرنس
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہوگی

دلّی:- ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کی انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس امسال اکتوبر میں علی گڑھ میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس میں اردو کے تحقیقی اور تعلیمی کاموں سے متعلق اہم مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا جائے گا جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے اساتذہ کو پیش آتے ہیں۔ (الجمعیۃ)

ایک تردید

الٰہ آباد:- کچھ دنوں پہلے ہم نے "ہماری زبان" میں یہ خبر اشاعت کے لیے بھیجی تھی کہ سنٹ نام اجیوں وکشمیر یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہوگئی ہیں یہ خبر شعبۂ اردو سری نگر کے استاد سے ملی تھی۔ لیکن اب ہمیں انھیں استاد کے ذریعہ یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ رسالہ نصاب میں شامل نہیں ہو سکی ہے۔

(مدیر ماہنامہ شب خون)

سید فضل المتین

بسمل خیرآبادی تلمیذ امیر مینائی

حالات ملک الشعرا لسان الملک[1] حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی میر منشی ریاست ٹونک[2] (منشی امیر احمد) امیر مینائی کے تلمیذ رشید مولینا عبدالحق خیرآبادی کے حقیقی بھانجے (مولینا حافظ سید احمد حسین رسوا کے بیٹے اور مضطر[3] خیرآبادی کے بڑے بھائی تھے۔

ترک وطن کے بعد بسمل ایک وقت تک اجمیر میں مقیم رہے، پھر ٹونک اور وہاں سے آبو چلے گئے۔ قیام ٹونک اور آبو کے وقت بھی اجمیر آمد و رفت کا سلسلہ برقرار رہا۔ اور آخری ایام اجمیر ہی میں گزار کر ۷۰ برس کی عمر میں بعارضہ ہیضہ اجمیر ہی میں انتقال فرمایا۔ اور اجمیر کے ایک قدیم مسلم محلہ اندرکوٹ میں مدفون ہوئے[4]۔

عمر کے آخری ایام میں ان کی ذات اجمیر میں مرجع خلائق بنی رہی اور یہ صاحب کشف و کرامات مشہور ہوئے۔ ان کی وفات کے ایک زمانہ بعد تک (آزادی سے پہلے) ان کی قیام گاہ ایک خاص اہمیت حاصل کئے رہی۔ جس مکان میں مقیم رہے۔ لوگ تبرکاً اٹھتے پر اس مکان کے ایک دروازہ سے داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے اور اچھے ہو جاتے۔

بقول عبدالقدوس ہاشمی، ان کا شمار امیر مینائی کے بہترین تلامذہ میں ہوتا تھا بڑے سنجیدہ اور باوقار آدمی تھے۔ غزل تحت اللفظ پڑھتے تھے اور ایک ایک لفظ نہایت وضاحت کے ساتھ ادا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبق پڑھا رہے ہوں۔

عقیدت خواجہ اور وفات بسمل کو حضرت خواجہ اجمیریؒ سے ایک خاص لگاؤ اور عقیدت تھی کہتے ہیں۔

کوئی کچھ بھی کہے لیکن۔ غلام خاص ہوں بسمل
معین الدین چشتیؒ کا معین الدین چشتیؒ کا

آستانہ خواجہ اجمیریؒ کی حاضری کو ذریعہ نجات تصور کرتے تھے اور صاحبزادگان آستانہ عالیہ کے ساتھ بڑے خلوص و ادب کے ساتھ پیش آتے تھے[5]۔

وفات سے ایک دن پہلے شام کو مزار خواجہؒ کے روبرو ایک غزل پڑھی اور صبح کو انتقال فرمایا۔ غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:

کٹے گی رو رو کے رات ساری تڑپ کے سب دن تمام ہوگا
لگا کے دل یہ خبر کسے تھی کہ ہائے جینا حرام ہوگا
جناب خواجہ کا آستانہ ہے بیکسوں کے لیے ٹھکانہ
جو بسمل اپنا ہے آب و دانہ تو بسمل کے وہاں پہ قیام ہوگا

(راوی میر امداد حسین ولد میر شفیع حسین برادر خواجہ اکبر حسین اکبر اجمیریؒ)

نمونۂ کلام

یاد نے پھر ان کا قد بالا کیا
حشر پھر دل نے مرے برپا کیا
کیا بتائیں ہجر میں کیا کیا کیا
آہ کی، فریاد کی، نالہ کیا
منہ چھپانا تھا نہیں پہلے ہی روز
اب کیا پردہ تو کیا پردا کیا
کس کو تھی تاب تجلی۔ برملا
آپ نے اچھا کیا۔ پردا کیا
مسند شاہی بھی بسمل خاک ہے
جس گھڑی اللہ پہ تکیہ کیا

فشار گور میں سختی بڑی ہے
مری تربت کا ہر تختہ کڑی ہے
کہاں مرقد پہ خاک کوئے جاناں
جو کھودی تھی وہی مٹی پڑی ہے
دھڑکنے دل کو رکھو جیب میں تم
کوئی پوچھے تو کہہ دینا گھڑی ہے

مرا دل کھو گیا اس بزم میں اے ہم نشیں دیکھو
ادھر دیکھو، ادھر دیکھو، یہاں دیکھو، یہیں دیکھو
انہی کے پاس ہے جو چپکے چپکے مسکراتے ہیں
انہی کا ہاتھ دیکھو جیب دیکھو، آستیں دیکھو

ہیں بدن میں زخم ہزار ہا وہ ہے کون جا کہ جہاں نہیں
مرے درد کو تو نہ پوچھیے کہ کہاں ہے اور کہاں نہیں
(از بیاض یادداشت۔ مولینا خواجہ حسن اجمیری)

وہ جلاتے ہیں اب تو گھی کے چراغ
میری تربت پہ روشنی کے لیے
اٹھ گئی دہر سے خوشی بسمل
زخم روتے ہیں اب ہنسی کے لیے

---

[1] از مضمون عبدالقدوس ہاشمی "بزم خلیل، ٹونک (۱۸۹۶ء)" مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۴۵ء۔

[2] نادم سیتاپوری۔ بسمل خیرآبادی کو غالب کا شاگرد کہتے ہیں۔
"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جناب مالک رام نے محققانہ احتیاط کے خیال سے بعض ایسے لوگوں کو "تلامذۂ غالب" میں شامل نہیں کیا ہے جن کے متعلق وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے۔ مثلاً حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی وغیرہ"۔

[3] مضطر۔ مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کے والد ہیں (ف۔م)

از مضمون "مردان علی خاں رعنا۔ تلمیذ غالب" مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء

[4][5] انبیاض یادداشت مولینا خواجہ حسن اجمیری برائے "تذکرۂ شعرائے اجمیر"۔

[6] آپ کے راوی اجمیر کے بہت سے ایسے حضرات ہیں جو بقید حیات ہیں۔ (ف۔م)

[7] از بیاض یادداشت مولینا خواجہ حسن اجمیری۔

(از۔ ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۵۵ء)

مضمون۔ عبدالقدوس ہاشمی

انتخابِ کلام

سکھاتا ہے ہمیں تو ناصحا کیا — جو دل آیا تو پھر اچھا برا کیا
تمہارے عشق میں سب ہے گوارا — اذیت کیا، مصیبت کیا، بلا کیا
مسیحا تو جلا دیتے ہیں مرتے — ہمارے درد کی جائیں دوا کیا
نمک پاشِ جراحت ہو جو قاتل — تو پھر اس سے زیادہ ہے مزا کیا
نہ بسمل جان دو ہجرِ صنم میں — ابھی دیکھو تو کرتا ہے خدا کیا

گرز دائے عشق گیسوئے رسا ہونے لگے
دل سے میرے قطعِ طولِ مدعا ہونے لگے
پھر نگاہیں دل کو پہلے سے ہدف کرنے لگیں
پھر ترازو تیر تیرے بے خطا ہونے لگے
روئے رنگیں کا تصور بے طرح جمنے لگا
تم نگینِ دل کے نقشِ مدعا ہونے لگے
کیا تعجب ہے جو عکسِ روئے سبزہ رنگ سے
اس پری کے کان کا پتا ہرا ہونے لگے
ذبح کی تو آرزو نکلی ہے بسمل بعدِ عمر
وہ جو زخموں پر نمک چھڑکیں مزا ہونے لگے
(گلدستہ پیامِ یار۔ لکھنؤ۔ جون ۱۸۸۶ء)

مضطرب جاں ہے شبِ غم میں نکلنے کے لیے
یہ بلا سر پہ نہیں آئی ہے ٹلنے کے لیے
شمع کی محفلِ دشمن میں ضرورت کیا ہے
دلِ غم دیدہ مرا کم نہیں جلنے کے لیے
عوضِ بوسہ ملا کرتی ہیں دشنام ہمیں
لبِ شیریں ہیں ترے زہر اگلنے کے لیے
دلِ پر درد میں ہے یاس کا اس درجہ ہجوم
راہ ملتی نہیں ارمان نکلنے کے لیے
داغِ حسرت کے سوا کچھ نہ ملے گا بسمل
شمع رویوں سے عبث ملتے ہو جلنے کے لیے
(گلدستہ پیامِ یار۔ لکھنؤ۔ جولائی ۱۸۸۶ء)

اے چرخ تو نے ہم کو زمانے میں کیا دیا
نالہ دیا جو ایک تو وہ نارسا دیا
اے عشقِ یار زخمِ جگر ہو کہ داغِ دل
جو درد تو نے جسم کو دیا لادوا دیا
مرغِ سحر جو ہجر کی شب بولتے نہیں
بختِ سیاہ نے مرے سر سے کھلا دیا
(گلدستہ پیامِ یار۔ لکھنؤ۔ دسمبر ۱۸۸۶ء)

دلِ بیتاب کی یارب ہو تسلی کیونکر
وعدۂ وصل پہ کرتا ہی نہیں "ہاں" کوئی
خلل انداز عقائد ہیں ترے زلف و رخ ہیں
نہ تو کافر ہی کوئی ہے نہ مسلماں کوئی
سب اسی بت کے طرفدار ہیں محشر والے
نہیں آنتوں میں ہے اشد مسلماں کوئی
کیوں مری جامہ دری سے ہیں خفا آپ حضور
چاک کرتا تو نہیں آپ کا داماں کوئی
کھیل لڑکوں نے بنایا ترے دیوانے کو
کوئی دامن لیے جاتا ہے گریباں کوئی
(از۔ انتخاب مشاعرہ اجمیر ۱۸۸۸ء از حکیم جگر بسوانی مضمون ۱۸۸۸ء از ۱۹۳۴ء مطبوعہ "عالمگیر" لاہور۔ سالنامہ ۱۹۳۴ء)

ایک نامکمل غزل

دلا ہستی سے جائے گا وہی با عز و شاں ہو کر
کرے نام و نشاں حاصل جو بے نام و نشاں ہو کر
دکھایا جلوۂ وحدت کو کثرت میں عیاں ہو کر
احد ظاہر ہوا ہے میم احمد میں نہاں ہو کر
نہ تیرا ساتھ بعد از مرگ بھی چھوڑوں گا اے قاتل
ترے دامن سے لپٹوں گا غبارِ ناتواں ہو کر
تماشا گاہِ طفلاں وہ زمیں کیونکر نہ بن جائے
نکل جائے ترا دیوانہ اے ظالم جہاں ہو کر
نہیں گر سائباں تربت پہ مجھ بیکس کی کیا غم ہے
مرا دودِ جگر سایہ کیے ہے آسماں ہو کر
بنایا ہے سبو مٹی کا میری بادہ نوشوں نے
ملا یہ مرتبہ خاکِ رہِ پیرِ مغاں ہو کر
جفا و جور کرنے سے کبھی الفت نہ جائے گی
محبت تیری آئی ہے مرے قالب میں جاں ہو کر
نہیں کروٹ تلک بھی مجھ سے لیجاتی ہے اے بسمل
ضعیفی اور یہ ناطاقتی ایسے جواں ہو کر
(از۔ ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۵۵ء)

مضمون عبدالقدوس ہاشمی

تلامذہ۔

بسمل کے تلامذہ میں منشی عبدالرحیم آنگر اجمیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان پر میں جلد ہی علیحدہ مضمون لکھوں گا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

"ایک نقاش شاعر" کے عنوان سے شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر ساڑھے آٹھ سو صفحوں کی ایک ضخیم کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کے مرتب مظفر حنفی ہیں اور ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔

یہ کتاب دراصل رنگا رنگ تحریروں کا ایک مجموعہ ہے جس میں تاثراتی مضامین، شخصی خاکے، تنقیدی و تجزیاتی مطالعے، تعزیتی شذرے، منظوم خراج عقیدت اور دو سطروں سے لے کر دس بارہ سطروں تک کی مجمل اور عمومی رائیں بھی شامل ہیں۔ شاد صاحب کی خودنوشت، ان سے لیے گئے بعض انٹرویو اور ڈھائی سو صفحوں کے لگ بھگ مکاتیب شاد ان پر مستزاد ہیں۔

غالباً یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ شاد عارفی اردو کے ایک صاحب طرز شاعر اور ایک منفرد و بے مثل طنز نگار تھے اور ان کے شعری اکتسابات اردو زبان و ادب کی بیش قیمت متاع ہیں لیکن انھوں نے جس کس مپرسی کے عالم میں اپنی زندگی گزاری وہ ہمارے لیے صرف عبرت انگیز ہے۔ گزشتہ پچاس سال کی شعری اور ادبی سرگرمیوں پر جن کی نظر ہے وہ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ اس دور میں ادنیٰ اور اوسط درجے کے لوگوں نے محض شاعری کا سوانگ رچا کر کیسی کیسی منفعت حاصل کی ہے۔ مشاعرے، فلم، ریڈیو، انجمنیں اور تحریکیں، حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے، ناشرین، سنگ بند نقاد اور زبان و ادب کی سرپرستی کا ذوق رکھنے والے کرسی نشین حضرات نے جن شاعروں کو اعزاز و اکرام سے نوازا ان میں سے کتنے حقیقی معنوں میں شاعر تھے اور کتنے متشاعر اس کا فیصلہ کچھ تو زمانے نے کر دیا ہے اور اگر نہیں کیا ہے تو مستقبل قریب میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو کر رہے گی لیکن افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم صداقت کو عام طور پر بہت دیر میں دریافت کرتے ہیں۔ ہم اپنے بہترین شاعروں کو ان کے جیتے جی پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے لیکن وہ عسرت اور تنگ دستی کی زندگی گزار کر جب مر جاتے ہیں تو ہمیں خبر ہوتی ہے کہ ؎

ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

شاد عارفی کو میں اس اعتبار سے خوش نصیب شاعر سمجھتا ہوں کہ ان کے انتقال کے صرف چار سال بعد ان کی ادبی خدمات کا اتنا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں شاد صاحب کی شخصیت پر جو مضامین ہیں ان میں اکبر علی خاں کا "ایک اور گنجا فرشتہ" مسعود اشعر کا "کٹی پتنگ" طاہرہ اختر کا "شاد عارفی میرے ماموں" اور مظفر حنفی کا "استاد محترم" اور عابد رضا بیدار کی تحریریں خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان مضامین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام طور پر یک طرفہ مدح سرائی اور مبالغے سے پرہیز کیا گیا ہے اور شاد صاحب کی بشری کمزوریوں کو قبول کرنے کے بعد ان کی شخصی تصویر کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاد صاحب کی خودنوشت تحریروں، سلطان اشرف اور رحس اقبال کی یادداشتوں اور شاد صاحب کے مکاتیب سے مل کر یہ حصہ شاد صاحب کی سوانح کو سمجھنے کے لیے ایک معتبر دستاویز کا کام کرتا ہے۔

شاد صاحب کی شاعری پر جو تنقیدی و تجزیاتی مطالعے ہیں ان میں سب سے پہلے ہمیں کتاب کے مقدمہ نگار مولانا امتیاز علی عرشی کی تحریر متوجہ کرتی ہے۔ عرشی صاحب نے بہت اختصار کے ساتھ شاد صاحب کے فن کی نمایاں خصوصیت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی طنز نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"طنز نگار کا کام سماج کی خامیوں کی گرفت ہے۔ یہ گرفت ایسے ہاتھ کی ہوتی ہے جو کسی عضو کے فاسد مادے کو نکالنے کی طاقت رکھتا ہو۔ یہی ہاتھ زخم پر پھایا بھی رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پھایا کا فوری فریم کا نہ ہو شنکچر آیوڈین کا ہو جو زخم میں جلن ڈالے مگر اس کا نتیجہ بہرحال زخم کا اندمال ہی ہوتا ہے۔ شاد عارفی نے جس جگہ نشتر زنی ضروری جانی، اپنی اسی مضبوط گرفت سے کام لیا۔ وہ کافوری مرہم کے قائل نہ تھے ٹنکچر آیوڈین کا استعمال کرتے تھے۔ تیکھا طنز، لہجے کی تیزی اور نوکیلا پن ان کا مزاج بن گیا تھا۔ ان کی آواز میں رام پور کا مرضانہ لہجہ اور پٹھانوں کا بانکپن الگ پہچانے جاتے ہیں۔"

شاد صاحب کے فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں جو مضامین ہمیں مدد دیتے ہیں ان کی تعداد خاصی ہے اور لکھنے والوں میں مختلف طرح کے لوگ ہیں۔ جن حضرات کی مختصر رائیں شامل کی گئی ہیں ان میں نیاز فتحپوری

عرش صہبائی

غزل

کتنے سنگین مراحل ہمیں درپیش رہے
ہم وفا کیش بہرحال وفا کیش رہے

زندگی میں نہ رہے کوئی توازن قائم
زندگی میں نہ اگر فکر کم و بیش رہے

دل نے سو بار کہا تھا کہ بغاوت کر دو
ہم روایات زدہ محوِ پس و پیش رہے

زندگی! ہم نے ترے ناز اٹھائے کیا کیا
تجھ کو کیا علم کہ کس حال میں درویش رہے

لذتِ دار و رسن لوٹ گئے اہلِ جنوں
اک تذبذب میں مگر عاقبت اندیش رہے

لازماً ان کی زمانے میں پرستش ہوگی
عرش، اس دور میں جو لوگ خدا کیش رہے

آل احمد سرور، احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری اور گوپال مِتل کی تحریریں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ کاش کہ یہ حضرات اور کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے یا انہیں تفصیل سے لکھنے کا موقع نکال سکتے۔

اس کتاب میں ایسے لوگوں کے مضامین بھی شامل ہیں جن سے بقول مرتب شاد صاحب کی عمر بھر چلتی رہی بغیر جانبدار اور انصاف پسند حضرات بھی ہیں اور نئی نسل کے وہ ادیب بھی جن کا خیال ہے کہ یگانہ کے بعد شاد عارفی ہی وہ دوسرے شاعر ہیں جن کی شاعری آج کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے اور اس کی معنویت ضرورت جدید شعراء کے لیے ایک اہم ورثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چند مضمون نگاروں کے نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند، ظ انصاری، کوثر چاند پوری، ماہر القادری، نشور واحدی، فرقت کاکوروی، عروج زیدی، بدر تسلیمی، ابر احسنی، شفا گوالیاری، منے میاں صابر رامپوری، مسیح انجم، ظفر ادیب، راہی معصوم رضا، اسلام مچھلی شہری، مظہر امام، حسرت الاکرام، احمد جمال پاشا، شہرت بخاری، ناصر کاظمی، بشیر بدر، شفیق حنفی، فضل تابش، ندا فاضلی، شمیم حنفی، مسرت حسین آزاد وغیرہ۔

تنقیدی و تجزیاتی مضامین کی بھی یہ خصوصیت قابلِ غور ہے کہ یہ مضامین یک طرفہ اور تعریفی نہیں ہیں بعض حضرات نے شاد صاحب کی فنی کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کی رائے سے متفق نہ ہوں) ایک صاحب نے ان کو یگانہ کے ساتھ رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور شاد صاحب کی شاعری کے دائرۂ اثر کو محدود قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "وہ جزو میں جزو کا تماشا کرتے رہے"۔ اس تنقید کا جواب ایک دوسرے مضمون میں مل جاتا ہے۔ ایک صاحب نے شاد صاحب کو ظفر علی خاں کی قبیل کا شاعر قرار دیا ہے۔ (یہ اکیلی رائے ہے۔ اس کا جواب بھی مضامین کے مجموعی مطالعے سے پڑھنے والے کو مل جاتا ہے) غرض کہ یہ بات خاص طور پر قابلِ قدر ہے کہ مرتب نے لکھنے والوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، صرف ایک گروہ کے لوگوں کو لکھنے کے لیے مدعو نہیں کیا صرف مداحوں اور طرفداروں کو اکٹھا نہیں کیا اور کسی رائے کو دبانے یا کسی بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طور پر یہ کتاب شاد صاحب کا ایک بے لاگ اور معروضی جائزہ بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

مظفر حنفی نے اتنی مکمل اور بھرپور کتاب شائع کر کے اردو کے ایک اہم اور قابلِ قدر شاعر کے متعلق اتنا اچھا اور قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے کہ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ خدا کرے کہ ان کی مرتب کی ہوئی دوسری کتاب "نثر اور غزل دستہ" بھی جلد ہی شائع ہو جائے۔ اس کتاب میں شاد عارفی کے مضامین اور ان کی غزلوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہوگا۔

شاد عارفی نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس دور میں صاحب دیوان اور صاحب مجموعہ بننا سب سے زیادہ سہل ہو گیا ہو اور چھٹ بھیّوں کے مجموعے اور دواوین مجلّا اور مطلّا ہو کر بازاروں میں دکھائی دیں اس دور میں ایسے منفرد اور صاحب طرز شاعر کا مجموعہ شائع کرنے کے لیے کوئی پبلشر آمادہ نہ ہوا۔ ان کا شعری سرمایہ کچھ نہیں تو دس بارہ مجموعوں میں سمٹ سکتا ہے لیکن ان کی زندگی میں ایک مجموعہ بھی ڈھنگ سے شائع نہ ہو سکا۔ نیا ادارہ لاہور والوں نے ان کا مجموعہ چھاپنے پر آمادگی ظاہر کی تھی لیکن وہ برابر ٹالتے رہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ایک رسالے میں اشتہار دیکھا کہ نیا ادارہ سے شاد صاحب کی نظموں کا مجموعہ "اندھیر نگری" شائع ہو گیا ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو اگرچہ اس اشتہار کو دیکھتے ہی بے اختیار کسی کا مصرع یاد آ گیا۔

یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گلِ صحرا۔ (شعری مجموعہ)

مصنف:۔ طالب جے پوری

ناشر:۔ طالب جے پوری۔ ۸، ہسٹنگز روڈ الہ آباد

صفحات:۔ ۱۰۰

قیمت:۔ دو روپے

رگِ ساز۔ (مجموعۂ کلام)

مصنف:۔ شاہین غازی پوری

ملنے کا پتہ:۔ پاک کتاب گھر۔ ۳۹ بڑا ٹول، ڈھاکہ

صفحات:۔ ۱۵۴

قیمت:۔ پانچ روپے

سخنہائے گفتنی۔ (جدید و اضافہ شدہ ایڈیشن)

مصنف:۔ کلیم الدین احمد

ناشر کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ

صفحات:۔ ۵۲۲

قیمت:۔ آٹھ روپے

---

۲۵ نظمیں ایک نظریہ ایک تجربہ

مصنف:۔ ڈاکٹر سید محمد صدرالدین فضا شمسی

ناشر:۔ کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ

صفحات:۔ ۱۹۴ قیمت:۔ تین روپے پچاس پیسے

انیس اوز

مکتوب لندن

لندن میں مشاعرہ

لندن کے سینٹ اینڈریوز ہال میں ۱۷ فروری کو ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اس مشاعرہ میں جو شعرا شریک ہو رہے ہیں ان میں مبر بشیر حکیم غلام نبی۔ ایس۔ ایچ شمسی بخش لائلپوری۔ ایشور سنگھ بدھ جیہ باو۔ گرشن تولا۔ ایم۔ ایس جاتی۔ عبدالقیوم۔ بہار کاشمیری۔ احسان جاوید۔ جمیل احمد مدنی۔ ڈاکٹر پرلاس اور ایم۔ ایس بقاک کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مشاعرہ کا اہتمام ہندوستان کے مشہور گلوکار ایس ڈی باتش نے کیا ہے۔ مہمانان خصوصی بی بی سی ٹیلیویژن کے مہندر کول اور سعید شاہ ہوں گے اور داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوگا۔

ریڈیو ٹائمز میں اردو پروگراموں کی تفصیلات شائع کی جائیں

مشرق نے بی بی سی ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ارباب اقتدار سے مطالبہ کیا ہے کہ آئندہ ریڈیو ٹائمز میں بی بی سی کے اردو پروگرام اپنا ہی گھر سمجھئے کی مکمل تفصیلات کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ بی بی سی کے دوسرے پروگراموں کی تفصیلات اور شرکائے پروگرام کی تصاویر باقاعدہ ریڈیو ٹائمز میں شائع ہوتی ہیں مگر کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اردو پروگرام کی تفصیلات اور تصاویر کی اشاعت سے گریز کیا جاتا ہے اس امتیازی بدسلوکی پر احتجاج کرتے ہوئے مشرق نے مطالبہ کیا ہے کہ بی بی سی اردو پروگراموں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک ترک کر دے۔

لائبریری عوامی امانت ہے

عبدالقیوم خواجہ صاحب نے ہم وطنوں کے طرز عمل کی شکایت کرتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ انھیں پچھلے دنوں بریڈ فورڈ کی سٹی لائبریری میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں اردو۔ ہندی۔ پنجابی اور بنگالی کتب کا ذخیرہ کافی موجود ہے لیکن انھیں ان کتابوں کی خستہ حالی پر بڑا دکھ ہوا کیونکہ بعض حضرات نے انھیں مشق ستم بنایا تھا۔ کتابوں پر مختلف حضرات نے اپنے قلم کی جولانی دکھائی تھی اور اس طرح کتابوں کو گندہ کر دیا تھا چونکہ کتب خانے قومی اور عوامی امانت ہیں اس لیے انھوں نے مطالعہ کرنے والے حضرات سے درخواست کی ہے کہ وہ کتابوں کو

نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا

نمونہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔

انتخاب مشرق۔ غزل از بہار کاشمیری

صبا تھی رقص کناں پھول نغمہ خواں یارو
غضب کی آگ برستی ہے اب یہاں یارو
شکن ابھرتی رہی ہے کسی کے ماتھے پر
کوئی سناتا رہا دل کی داستاں یارو
زمیں سے رشتہ ہے کچھ ایسا استوار اپنا
نظر میں جچتا نہیں کوئی آسماں یارو
یہ گرد باد یہ طوفاں یہ موسموں کا مزاج
اجاڑ دے نہ کہیں اپنی بستیاں یارو
ادھر حیات کی ٹھی ادھر نشاط کا رم
وہ میری رزم میں آئیں گے اب کہاں یارو

فارم ۱۷

دیکھو رول ۸

اخبار ہماری زبان

علی گڑھ

۱۔ مقام اشاعت	سلطان جہاں منزل علی گڑھ
۲۔ نوعیت اشاعت	ہفتہ وار
۳۔ نام پرنٹر	ضمیر الدین قریشی
قومیت	ہندوستانی
پتہ:	مسلم ایجوکیشنل پریس محلہ نئی سرائے اچلان علی گڑھ
۴۔ نام پبلشر	نذیر حسن
قومیت	ہندوستانی
پتہ:	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
۵۔ نام ایڈیٹر	پروفیسر آل احمد سرور
قومیت	ہندوستانی
پتہ:	شبلی روڈ علی گڑھ
۶۔ نام و پتہ مالک اخبار	انجمن ترقی اردو ہند۔ سلطان جہاں منزل علی گڑھ

میں نذیر حسن تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۶۸ء — نذیر حسن

مراسلات

غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات

ادھر دو ایک سال کے اندر غالب کا ایک قطعۂ تاریخ وفات کسی رسالے میں شائع ہوا تھا جس کا ایک مصرع یہ ہے

غالب جو مر گیا ہے تو ذوق اداس ہے

اگر کوئی صاحب ذوق اس قطعہ کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں کہ یہ کہاں شائع ہوا ہے مکمل قطعہ کیا ہے اور کس کا ہے تو شکر گزار ہوں گا۔

(اکبر علی خاں رضا لائبریری رامپور)

ایک دعوتِ فکر کے بارے میں

۸ر فروری ۹۸ء کے شمارہ ۵ میں "ایک دعوت فکر" کے عنوان سے مراسلہ شائع ہوا تھا۔ جس میں ادارہ کی جانب سے مندرجہ ذیل نوٹ ہے۔

"یہ غزل مراسلہ نگار کو کہاں سے ملی ہے اس کا خط میں کوئی تذکرہ نہیں ہے اس غزل کو غالب سے کن لوگوں نے منسوب کیا ہے۔ اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں ہے یہ باتیں واضح ہونی چاہیے۔" (ادارہ)

ادارہ ہماری زبان و قارئین کے معلومات میں اضافہ کے لیے جو کچھ مجھے معلوم ہے اُسے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ بقول جناب شوکت عظیم صاحب آج سے تقریباً پانچ چھ برس قبل ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک ادبی اجتماع کیا گیا تھا جس میں ایک شخص شریک تھا اس نے ترنم سے غزل پڑھی تھی اس کا نام محمد ایوب خاں معروف بہ بیتاب دیوانہ تخلص شورگراں اجمیر شریف کا رہنے والا تھا ہندوستان کے مشہور موسیقار چاند خاں جو شاعر تھے اور چاند پیا تخلص کرتے تھے ان کے خاندان سے تھا۔ ڈاکٹر حکم چند نیر نے اس شخص سے اس غزل کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ "اپنے پرانے بکس سے ایک قدیم بیاض کے منتشر اوراق میں یہ غزل درج ملی تھی۔" حکم چند نیر اور دوسرے لوگوں نے بہت سے سوالات کئے لیکن شخص پوری تفصیل سے جواب نہیں دے سکا اور اس نے کہا کہ "میرے خاندان کے کچھ بڑے افراد تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے ہیں ان سے دریافت کرنے کے بعد جواب تشفی بخش دوں گا۔"

حکم چند نیر اپنے مضمون "غالب کی ایک غزل" جو "صبا" حیدرآباد میں شائع ہوا تھا میں تحریر کیا ہے کہ اس شخص سے بہت دنوں تک خط و کتابت کی لیکن عدم جواب کی صورت میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ چند دن قبل اس سلسلہ میں جناب شوکت عظیم صاحب نے بھی ایک مختصر مضمون لکھا تھا جو جنوری ۹۸ء کے "عارض" دہلی میں شائع ہوا ہے۔

(نثار احمد صدیقی)

ڈاکٹر صفدر آہ کا شکریہ

۱۵ر جنوری کے ہماری زبان میں ڈاکٹر صفدر آہ کا مختصر نوٹ نظر سے گزرا۔ اس کے بے حد سنجیدہ اور سلجھے ہوئے لہجے کے لیے تہ دل سے مشکور ہوں۔ عروض کے بارے میں ان کا اور میرا موقف بالکل واضح ہو چکا ہے اس لیے اس موضوع پر مزید کچھ نہیں کہنا۔ انھوں نے مراسلے کے آخری جملے میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر گیان چند ہماری زبان کے ایک مستند محقق ہیں۔" میں یہ جملہ پڑھ کر لرز گیا۔ یہ نمائشی کسر نفسی سے کام نہیں لے رہا صدق دل اور خلوص کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ میں اس منصب بلند کے آس پاس بھی نہیں پہنچا۔ کاش مجھے کبھی اس مقام پر پہنچنے کی توفیق ہو سکے۔

آخر میں ایک دلچسپ انکشاف کیا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے سیاہ بالوں کی نمائش کرنا چاہی ہے۔ عرض ہے کہ ولادت سے آج تک میرا سر کبھی سیاہ بالوں سے آشنا ہی نہیں ہوا۔

(گیان چند)

کرناٹک کے اردو شعراء متوجہ ہوں

راج ناما پرکاشن ہبلی کی جانب سے کرناٹک کے ابھرتے ہوئے طنز و مزاح نگار اور "ہم کہاں کے دانا ہیں" کے مصنف پروفیسر مجوب بڑائی ہبلوی (ڈبل) ایم۔ اے "نوائے کرناٹک" کے عنوان سے بمبئی کرناٹک دھیئی دھارواڑ۔ بیلگام۔ کاروار اور بیجاپور اضلاع کے تمام اردو شعراء وادباء کا ایک تعارفی دستاویز مرتب کر رہے ہیں جس میں ہر شاعر کا مختصر تعارف، کلام اور فوٹو شائع ہوگا۔

لہذا کرناٹک کے تمام اردو شاعروں اور ادیبوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے اور اپنے شاعر و ادیب دوستوں کے پتے مندرجہ ذیل پتے پر روانہ فرمائیں۔

پتہ:۔ پروفیسر ایم۔ اے۔ بڑائی بجار بارا گلی ولڈ ہبلی
ہبلی (ریاست میسور)

اردو میں خواتین کا اولین ناول

"اردو میں خواتین کا اولین ناول" مطبوعہ اخبار "ہماری زبان" بابت ۲۲ر جنوری ۱۹۹۸ء (از سید سلیمان حسین شہنشاہ بلڈنگ نخاس لکھنؤ) کے سلسلہ میں مزید تائید کے طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ناول "اصلاح النساء" مصنفہ رشیدۃ النساء کا زمانہ تصنیف ۱۸۸۱ء ہے ناول زیر بحث کی بابت تفصیلات میں نے اپنی کتاب "چند ادبی مسائل" اور ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب "قدر و نظر" میں درج کر دی ہیں۔

(شاہ مقبول احمد صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج کلکتہ)

غالب میموریل عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے صدر جمہوریہ کی تقریر

نئی دہلی ۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۵ فروری کو یہاں مرزا غالب کی یادگار عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے ایک تقریر کی جس کا متن درج ذیل ہے۔

میں ریاست دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر جھا صاحب کا دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمارے ملک کے مایہ ناز اردو اور فارسی زبان کے بے مثل شاعر اردو کی جدید نثر کے بانی، مرنجان مرنج انسان دوستی اور وسیع المشربی کی مثال، میرزا نوشہ غالب اسد اللہ خاں غالب کی یادگار عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کا شرف مجھے بخشا۔ اس بات کی مجھے اور بھی خوشی ہے کہ یہ موقع مجھے دہلی میں ملا کہ غالب ان لوگوں میں تھا جن سے اس مردم خیز شہر کی آبرو ہے یہ وہ "تاریخی شہر" ہے جس نے سب سے زیادہ واضح طور پر ہندوستانی تہذیب کو ایک گنگا جمنی تہذیب ہونے کے تصور سے عملی شکل دی۔ ملک کے ہر بہی خواہ کا یہی ارمان ہونا چاہیے کہ اس کی آئندہ ترقی اسی ڈگر پر چلے۔ اردو زبان، مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے تمدن کے اس رجحان مقدس کا علم ہے دہلی اس کا گھر ہے اس کا مرکز رہا ہے دہلی کے چپے چپے پر اس کے آثار زمانہ کی بے اعتنائی کے باوجود نمایاں ہیں اس کے بنانے سنوارنے نکھارنے والوں کے "نادروں جیسے درخشانی جوہر" سب اسی کی خاک تلے روپوش ہیں۔

چپہ چپہ یہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

دہلی ہی ان کی آرزوؤں ولولوں اور کاوشوں کا مرکز تھا سیکھنا سکھانا، بننا بنانا، کہنا اور سننا، دینا اور لینا کھلے دل کے ساتھ دینا اور ساتھ لینا ان کا شعار تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی اس تقدیر کو جو آج پھر اس پر منکشف ہو رہی ہے آج سے صدیوں پہلے تاڑ لیا تھا اور جان گئے تھے کہ ان کے پیارے وطن میں قدرت آدمیت کا ایک نیا سانچہ بنانا چاہتی ہے جس میں متعدد قوموں اور بھانت بھانت کے تمدنوں کا امتزاج ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی کسی سینوں میں بہت سے ناموافق حالات کے باوجود بھی کہ یہ سانچہ اب پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہندوستان کی شوکت جس سے شاید سارے جہان میں بنے گا۔ اور اس کے بنانے کے شرف میں ہمارا دامن کسی اور سے پیچھے نہ رہے گا۔ میں خیال کی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا مقصد اس بات پر اپنی احسان مندی اور مسرت کو ظاہر کرنا تھا کہ ایک ایسے نامور کی یادگار کی بنیاد رکھنے کے لیے آپ نے مجھے یاد کیا جس کے نام لینے سے یہ سب خیال دل میں آنے لگتے ہیں مجھے امید ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد آج رکھا گیا ہے وہ جلد بن کر تیار ہو جائے گی مگر عمارت کا بن جانا پہلی اور سب سے غیر اہم منزل ہے عمارتیں تو مقبرہ بھی بن کر رہ جاتی ہیں ضرورت ہے کہ اس میں زندگی کی قوتیں کارفرما ہوں تو وہاں کا یہ ماحول کہ اس عمارت میں کام کرنے والوں کی ایسی مدد ہو کہ وہ غالب کو نئے نئے روپ میں قوم کے سامنے زندہ کر کے لائیں اور جو اقدار غالب کی زندگی میں کارفرما تھیں ان کو دل اور دماغ دونوں کے سہارے سمجھائیں اور ان کی تنقید سے بھی نہ گھبرائیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا اگلے سال ان کی سو سالہ برسی منائی جائے گی اس موقع پر غالب غالب کے سلسلے میں بہت سے ادارے بہت سے کام انجام دیں گے ان کی کتابوں کے تنقیدی ایڈیشن جگہ جگہ سے نکلیں گے ان کی زندگی سے متعلق بہت سے سوال جن کا جواب اب تک اطمینان بخش نہیں ملا ان کی کھوج کی جائے گی غالب پر پچھلے دنوں خاصا تحقیقی کام ہوا بھی ہے مگر بہت کچھ اور ہو سکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کی صحیح جگہ یونیورسٹیاں ہیں کہ تلاش حق ہی ان کا منصب اور ان کا فرض ہے جن چیزوں کی بعض دفعہ بظاہر بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی تحقیق پر یہ اہل علم سر کھپاتے ہیں وہ باہر والوں کو حقیر معلوم ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ان کے کام کا بڑا اہم جز ہیں جب کوئی شاعر یا ادیب یا مورخ یا مفکر ایسے بلند مرتبے کو پہنچ جاتا ہے جیسا کہ غالب کو شعر و ادب کی دنیا میں نصیب ہے اور یونیورسٹیاں اسے اپنی توجہ کا مستحق مان لیتی ہیں تو پھر ہر چھوٹی بڑی بات مستحق توجہ ہو جاتی ہے اور تحقیقی کام کے سب ہی آداب ہر جز میں ملحوظ رکھے ہوتے ہیں مگر شاعر پر توجہ کا ایک اور بڑا میدان خود اس کا شعر ہے قطع نظر اس کے کہ استاد کون تھے اور نانی کا حال معلوم ہے یا نہیں یا ماموں کے متعلق سب تفصیلیں جمع کر لی گئی ہیں یا نہیں۔ اس لیے کہ میرے خیال میں شعر ایک وجود مستقل رکھتا ہے شاعر سے الگ۔ کون گنگناتا ہے آپ کے سامنے کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

تو پہلے آپ سر دھنیں گے یا یہ پوچھیں گے کہ اس شاعر کی نانی اور ماموں کے متعلق تفصیلات بتاؤ آپ کو اگر معلوم ہو کہ شعر کس نے کہے ہیں تو بھی کیا یہ آپ کے دل میں نہ اتریں گے سچ ہے کہ یہ دنیا آدمیوں اور چیزوں کی غالب کو ہر دم گھیرے ہوئے تھی اور اس کا جتنا سراغ لگ جائے اچھا ہی ہے مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک دنیا وہ ہے جو غالب نے خود بنائی ہے بسائی ہے سجائی ہے الفاظ اور معنی کی ایک دنیا جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اس دنیا میں اترنے اس سے لطف اندوز ہونے کبھی کبھی اس میں گم ہو جانے کا سامان ہونا چاہیے اور مجھے امید ہے کہ یہ یادگار جو آج آپ بنانا شروع کر رہے ہیں اس کام میں مدد دے گی غالب کی بنائی ہوئی دنیا کا شہری بننے میں صاحبان طلب کو مدد دے گی مجھے امید ہے کہ یہاں غالب سے متعلق ہر کتاب خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو یہاں سے مل

ہے کہ شعری اہمیت سے متعلق غالب کے ہمعصر شاعروں کے متعلق غالب کے عہد سے متعلق مکمل سے مکمل سرمایہ یہاں جمع کرایا جائے گا شاعری اور خاکے بھی یہاں مہیا کریں گے اور ذوقِ شعری کی تربیت کے جلسے بھی کیے جائیں گے خود اس عمارت کی اندرونی سج دھج ایسی بنائی جائے گی کہ غالب کا زمانہ آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ میں آخر میں حجاب صاحب اور فخرالدین علی احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس موقع پر مجھے یاد فرمایا۔ اور زیادہ شکرگزار اس وقت ہوں گا۔ جب یہ یادگار قائم ہو جائے گی اور وہ کام انجام دے گی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے (ریاست)

غالب نے آنے والی نسلوں کو نیا اندازِ فکر جدید رجحان اور ترقی پسند شعور بخشا

اترپردیش غالب صد سالہ جشن کمیٹی میں مقررین کا اظہار خیال

لکھنؤ۔ غالب کی عظمت اور اس کی ہمہ گیر مقبولیت کی بنیاد صرف اس پر نہیں ہے کہ اس نے ہمارے لیے بہت سے ادبی جواہر پارے چھوڑے ہیں یا تخیل کی بلند پروازی، جذبات کی شدت، تفکر کی گہرائی، مشاہدے کی جدت، طرزِ ادا کی ندرت اور حسنِ بیان کی لطافت کے شاہکار چھوڑے ہیں بلکہ اس کے جاوداں ہونے کا راز یہ ہے کہ اس نے آنے والی نسلوں کو ایک نیا اندازِ فکر، ایک جدید رجحان اور ایک ترقی پسند شعور بخشا ہے۔ ان خیالات کا اظہار یہاں غالب صد سالہ جشن کمیٹی اترپردیش کی طرف سے یومِ غالب کے موقع پر مقررین نے کیا۔ یہ تقریب ریاستی گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی کی صدارت میں میونسپل کارپوریشن کے ترلوک ناتھ ہال میں ہوئی۔ مقررین نے کہا کہ غالب شمع شعر کا ایک مینارہ ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے مختلف راستوں کو اس طرح منور کرتا ہے کہ اس کے معتقد جو راہ چاہیں اپنے لیے متعین کرلیں غالب نے روایت سے بغاوت کا راستہ اور رسمیت سے ہٹ کر ایک جداگانہ زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی بھی دعوت دی ہے۔ گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ جشن غالب آج کی تاریخ سے آئندہ سال کی ۱۵ فروری تک منایا جائے گا جیسا کہ ٹیگور کی صد سالہ تقریبات منائی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا میری آرزو ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی محبانِ اردو موجود ہوں یہ تقریب منائی جائے امریکا اور روس کے اہلِ علم بھی اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے بہترین کلام میں دنیائے محبت کے نئے گوشے نظر آتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غالب کے کلام کا ذکر کرتے ہوئے گورنر نے کہا کہ غالب نے حقیقتاً ایک حسین چمن کا پھول دیا ہے جس کا انوکھا رنگ کم نہ ہوگا اس کی خوشبو ہمیشہ رہے گی۔ حضرت والی ڈاکٹر جناب اعزاز حسین ایم ایل اے صدر جشن کمیٹی، اور جناب پی این سیٹھی (جنرل سکریٹری) نے بھی اپنی مختصر تقریروں میں غالب کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

انجمن ترقی اردو آندھرا کا وزیرِ اعلیٰ کی خدمت میں میمورنڈم

انجمن ترقی اردو آندھرا کے صدر لئیق جناب نجیب رزمی صاحب نے آندھرا کے وزیرِ اعلیٰ کی خدمت میں حسب ذیل میمورنڈم پیش کیا۔ میں آپ کی خدمت میں حسب ذیل حقائق پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں ان پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔

اخبارات کی اطلاع کی بموجب آپ کی رہنمائی میں حکومت آندھرا پردیش سہ لسانی فارمولے کی توثیق کر کے اپنی لسانی پالیسی کا اعلان کرنے والی ہے۔ جہاں تک ہماری ریاست کا تعلق ہے اس فارمولے میں جو تین زبانیں شامل کی جائیں گی وہ تلگو، ہندی، اور انگریزی بتائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسکیم میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس صورت حال سے آندھرا پردیش کے اردو والوں میں سخت بے چینی پھیل گئی ہے یقیناً آپ یہ توقع نہیں رکھتے کہ اردو بولنے والے بچے متذکرہ بالا تینوں زبانوں کی خاطر اپنی مادری زبان کو ترک کردیں۔ دوسری طرف اگر وہ اپنی مادری زبان بھی سیکھیں جیسا کہ انھیں سیکھنا چاہیے تو سہ لسانی فارمولا ان کے لیے چہار لسانی فارمولا بن جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی سمجھدار آدمی زبانوں کے اتنے بھاری بوجھ کے عاید کرنے کو پسند نہیں کرے گا۔ اس دشواری پر قابو پانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تیسری زبان کا سیکھنا لازمی نہ ہو۔ لزوم صرف دو زبانوں کی حد تک رہنا چاہیے، جن میں سے ایک مادری زبان ہوگی اور دوسری کوئی اور زبان۔ مثال کے طور پر آندھرا پردیش میں تلگو بولنے والے بچے ہندی یا انگریزی سیکھ سکتے ہیں جب کہ اردو بولنے والے بچے تلگو یا ہندی یا انگریزی سیکھ سکتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ آندھرا پردیش کے اردو والے اپنی مادری زبان کے بعد تلگو کی تحصیل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ میں اردو والوں کی بہت بڑی اکثریت کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ تلگو دیس میں رہتے ہوئے وہ تلگو زبان پر قدرت حاصل کرنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ان کی بہت بڑی اکثریت کے لیے تلگو اور اردو کی واقفیت زندگی کے کم و بیش ہر شعبہ میں خاطر خواہ کامیابی کے لیے کافی ہے۔ تیسری زبان کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پیش آئے گی جو آندھرا پردیش کے باہر قسمت آزمائی کرنا چاہیں گے اور ان کی تعداد یقیناً بہت کم ہوگی ان کے لیے ہندی یا انگریزی سیکھنے کے مواقع رہیں گے اور انھیں ریاست سے باہر قسمت آزمائی کی خاطر تیسری زبان کے سیکھنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ بنا بریں آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آندھرا پردیش کے اردو والے بچوں کے لیے اپنی مادری زبان اور علاقائی زبان تلگو کی لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ تیسری زبان سیکھیں یا نہ سیکھیں۔ ان میں سے جو تیسری زبان سیکھنا چاہیں گے وہ ہندی یا انگریزی میں سے کسی ایک زبان کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا اس سے اردو والے یا تو وہ اپنی مادری زبان سے محروم ہو جائیں گے یا پھر ان پر چار زبانوں کے سیکھنے کا بھاری بوجھ عاید ہوگا جو کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں ہے۔

انجمن ترقی اردو رانچی کے جلسہ میں پروفیسر آل احمد سرور کی تقریر

رانچی۔ آزاد ہائی اسکول کی عمارت میں زیر صدارت علامہ پروفیسر جمیل مظہری انجمن ترقی اردو شاخ رانچی کی ایک خصوصی نشست منعقد ہوئی۔ سب سے پہلے انجمن ترقی اردو شاخ رانچی کے صدر ذکی الدین احمد ایم۔ اے نے معزز مہمان اور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کا خیر مقدم کیا اور رانچی انجمن کے اراکین سے ان کا تعارف کرایا۔ بعدہٗ انجمن کی تنظیم کے متعلق بہت سی باتوں پر روشنی ڈالی اور پروفیسر آل احمد سرور سے گزارش کی کہ وہ اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کریں۔ پروفیسر سرور نے کہا کہ میں آپ کی کارگزاریوں سے بہت متاثر ہوا۔ آپ کا پروگرام یقیناً اچھا ہے۔ اس میں عقیدے کی پختگی نظر آتی ہے اور عمل کی گرمی بھی۔ آپ اپنے پروگرام پر ضرور کاربند رہیں۔ اس پر آشوب دور میں انجمن کی تنظیم کو اور زیادہ مضبوط بنانا ہے اس کے لیے اس کے لیے ہم سب کو مل کر کوشش کرنی چاہیے۔ ملک کی سیاسی الجھنوں کی وجہ سے اردو کا معاملہ پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیاں صرف اپنے مفاد کو دیکھتی ہیں اور ملک میں اردو کے نام پر فساد کراتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارا ہی صرف نقصان نہیں ہوتا ہے بلکہ پورے ملک کا نقصان ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ آگے چل کر موصوف نے فرمایا کہ ہم نہیں چاہتے کہ سارے ہندوستان کی سرکاری زبان اردو ہو بلکہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ (علاقائی زبان و مردم شماری کے مطابق) لوگوں کی بولی جانے والی زبان کی حفاظت کی جائے۔ اب تو یہ تعداد اور زیادہ ہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ کچی باتیں دیر میں مانی جاتی ہیں۔ ہم لوگوں کو قومی وقیع کام کرنا ہے۔ ہم اپنی قوت کو محض احتجاجات اور تقریری کاموں میں نہ صرف کریں بلکہ اپنے آپ کو منظم کریں۔ ہم لوگوں کو اردو کا جال سارے ملک میں پھیلا دینا ہے یہی بڑا کام ہوگا اور اس سے دوسرے بھی متاثر ہوں گے۔ تمام کاموں میں بنیادی کام تعلیم کا ہے۔ اگر ابتدائی اور ثانوی درجے تک اردو میں تعلیم نہ دی جائے تو سب بے کار ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعے ہم اپنی تہذیبی قدروں کو پا سکتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو ابھار سکتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ فوراً اعلیٰ منزل پر اردو ہو جائے مگر جیسے ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہر جگہ اردو میں ہو۔ اردو میں پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی سہولتیں فراہم ہوں۔ زندگی کے مختلف شعبوں کے لوگوں کو مثلاً ڈاکٹروں اور انجینیروں کو بھی اردو سے واقفیت ضروری ہے۔ ہم لوگوں کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو نہ صرف ڈاکٹر اور انجینیر ہی ہوں بلکہ وہ اپنے ادب کے پرستار بھی ہوں۔ پروفیسر موصوف نے مزید کہا کہ آپ کا یہ علاقہ اب صنعتی ہو گیا ہے اور ملک کی زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ آپ کی ریاستی شاخ کافی اچھی ہے اور آپ کی رانچی کی شاخ بھی منظم ہے۔ آپ لوگوں کے جذبہ کو دیکھ کر آپ کے خلوص کا علم ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی تہذیبی قدروں سے واقف ہوتے ہیں اور جن کے عمل میں حرارت ہوتی ہے وہ الجھے ہوئے اور مشکل حالات میں بھی اپنا راستہ نکال لیتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اپنے زبان و ادب کے ذریعہ اپنی شخصیت کو ابھارنا ہے اور سماج کو بھی فائدہ پہنچانا ہے۔ بہت سے لوگ موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہیں لیکن اس تاریکی میں بھی ضرور راستہ نکلے گا۔ آپ یہ یاد رکھیں کہ اچھا راستہ وہی ہوتا ہے جو لمبا ہوتا ہے۔ صدر محترم پروفیسر جمیل مظہری نے کہا کہ آل احمد سرور صاحب کی وجہ سے میرا ایک اصول ٹوٹ گیا۔ میں کسی جلسے کی صدارت نہیں کرتا ہوں مگر سرور صاحب کی وجہ سے آج یہ اصول بھی ختم ہو گیا۔ میں دعا گو ہوں کہ سرور صاحب کی قیادت میں اردو کی ترقی ہو۔ آخر میں سید ابو الحیات شیدا نے صدر محترم اور معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا اور جلسے کی کارروائی بحسن و خوبی ۶ بجے ختم ہو گئی۔ (ذکی الدین احمد ایم۔ اے صدر انجمن ترقی اردو رانچی)

انجمن ترقی اردو دہلی میں یوم غالب

دلی۔ انجمن ترقی اردو دلی کی جانب سے مرزا غالب کو ۲۶ فروری کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ تقریب کا آغاز حسب معمول تین بجے قرآن خوانی سے ہوا۔ پھر غالب کے مزار پر مرکزی وزیر صنعت عالی جناب فخر الدین علی احمد، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر تارا چند اور متعدد ادبا و شعرا، ممبران پارلیمنٹ اور سرکردہ شہریوں نے گلپاشی کی۔ اس کے بعد غالب کی غزلیں قوالوں نے آدھ گھنٹے تک پیش کیں۔ چار بجے جناب فخر الدین علی احمد نے یوم غالب کا افتتاح کیا۔ فخر الدین صاحب نے فرمایا کہ میں دلی میں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا لیکن تعلیم ختم کرنے کے بعد میری عمر کا زیادہ حصہ دلی سے باہر گزرا ہے اور یہ میرا حسن اتفاق ہے کہ غالب کی ننانویں برسی پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے آپ سب لوگوں کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ میں صدر انجمن پنڈت سندر لال کا مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے اس موقع پر یاد کیا۔ اردو کے متعلق فخر الدین علی احمد صاحب نے فرمایا کہ اس زبان نے بہت اچھے شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ زبانوں کی ترقی شاعروں اور ادیبوں سے ہوتی ہے جن سے زبان طاقتور اور مقبول عام ہوتی ہے۔ غالب کو اس معاملے میں برتری حاصل ہے۔ اب غالب کی وفات کو ننانوے سال ہو گئے اور مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے اس عظیم شاعر کی شہرت ہمہ گیر ہے۔ ہندوستان کے باہر روس، امریکہ، مغربی جرمنی، انگلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں مرزا کے کلام پر تحقیقی اور تنقیدی کتابیں لکھی گئیں۔ غالب نے اردو اور ہندوستان کا نام بیرونی ممالک میں روشن کیا۔ اور وہاں کے لوگ غالب کے سبب ہندوستان کے بارے میں بہت کافی جاننے لگے ہیں۔ آئندہ سال صد سالہ تقریبات منعقد ہوں گی۔ اس سلسلے میں ایران، روس، فرانس، جرمنی، انگلینڈ، امریکہ اور دوسرے کئی ممالک میں تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ روس سے مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں دیوان غالب کو اردو، انگریزی، روسی اور روس میں بولی جانے والی تمام مختلف زبانوں میں آئندہ سال شائع کیا جائے گا اور دنیا بھر میں تقسیم کیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اس موقع پر پیچھے نہ رہے

بے حد بڑی مسرت ہے کہ ابھی دو تین روز قبل صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں غالب میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھ چکے ہیں۔ کسی نے مجھے بتایا کہ جہاں یہ ہال بنایا جا رہا ہے یہیں کہیں غالب ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی کے زمانے میں جھاڑیوں میں آکر چھپے تھے۔ فخر الدین علی احمد صاحب نے جو مرکزی کمیٹی غالب جشن صد سالہ کے سکریٹری ہیں آگاہ کیا کہ آئندہ سال کی تقاریب کے لیے اعلیٰ پیمانے پر تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ اس لیے میری دلی دانوں سے پرزور اپیل ہے کہ اس سلسلہ میں ہر شخص جو بھی امداد دے سکتا ہے دے۔ آخر میں فخر الدین صاحب نے فرمایا کہ ہم اس موقع پر ایک بین الاقوامی سیمینار بھی کر رہے ہیں تاکہ باہر کے محققین نے غالب پر جو کام کیا ہے اس سے ہندوستان کے لوگ بھی روشناس ہو سکیں۔ میری خواہش ہے کہ ہندوستان تمام صوبوں میں بھی دلی کے علاوہ غالب کی سو سالہ برسی منائی جائے۔ بمبئی، حیدرآباد اور لکھنؤ میں تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر میں بھی ریاستوں کا دورہ نہیں کر سکا میں کوشش کروں گا کہ مدراس اور کیرالا جیسے علاقوں میں بھی یہ تقریب ہو۔ حیدرآباد میں جس طرح یہ کام ہو رہا ہے میں اس سے بہت مطمئن ہوں۔ میموریل ہال کی تعمیر کے کام میں دلی سے باہر کے لوگوں کو بھی مدد کرنی چاہیے۔

بزم مقالات میں ڈاکٹر تاراچند صاحب نے مختصر تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے غالب اور اس کا فن کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ نشست کے آغاز میں جناب جگن ناتھ آزاد نے غالب پر اقبال کی نظم سنائی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ غالب کو جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی قوت فکر ہے، غالب ایک انٹلکچول شاعر تھے۔ ان کے کلام میں تخلیقی ذہن موجزن ہے وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے زندگی کے بارے میں ایسے تصورات پیش کیے ہیں جو ہماری سوچنے کی قوت کو فکر انگیز کرتے ہیں۔ ذوق، ناسخ اور میر زبان و بیان اور محاوروں کے استاد ہیں لیکن ان کے یہاں غالب کا تفکر نہیں ہے غالب کی ایک اور خصوصیت ان کی انفرادیت ہے جو ان کی ہر غزل میں نظر آتی ہے مرزا کے کلام میں ایک مردانہ قسم کی انانیت ہے جو تکبر سے مبرا ہے۔ چھ بجے یہ نشست ختم ہوئی۔ سات بجے شام کو طرحی مشاعرے کا افتتاح مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات جناب کے کے شاہ نے کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا غالب ایک بہت بڑے انقلابی تھے جنھوں نے اپنے دور کی ناہمواریوں پر آزادی سے اظہار خیال کیا اور عوام کو سوچنے کے نئے زاویوں اور زندگی کی نئی راہوں سے روشناس کیا۔ غالب کا موازنہ شیکسپیر سے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا کہ دونوں کی تخلیقات میں زندگی کے ہر موقع کے لیے اشعار ملتے ہیں اور دونوں نے نوع انسان کی ہر قلبی و ذہنی منزل میں ایک وحدت اور ہم آہنگی کی طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔ غالب ایک نڈر، باہمت اور بلند نگاہ شاعر تھے زندگی بھر ان پر مفلسی طاری رہی لیکن وہ کبھی مایوس نہ ہوئے انھوں نے ہمیشہ امید سے کام لیا۔ ان کی نظم نے انھیں مزید متاثر کیا لیکن اس کیفیت کے اظہار میں ایک حسن اور رنگینی ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی تقریر کے دوران غالب کے کئی شعر پڑھے نشست کا آغاز غالب کی غزلوں سے ہوا جو استاد نصیر خاں اور ہادی خاں نے ایسے دلکش انداز میں پیش کیں کہ فضا پرکیف ہو گئی۔ پھر تقریباً چالیس شعرائے کرام نے اپنا طرحی کلام پیش کیا اور ساڑھے دس بجے رات کو یہ مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

(جنرل سکریٹری)

انجمن ترقی اردو بنارس میں یوم غالب

بنارس ۱۰۔ جے پی جین انٹر کالج بنارس میں انجمن ترقی اردو بنارس کی جانب سے یوم غالب منایا گیا۔ صدارت کے فرائض جناب بلیشور رائے صاحب پرنسپل کالج مذکور نے انجام دئے۔ جلسہ میں طلبہ، اساتذہ کے علاوہ شہر کے کچھ ممتاز کلا بھی شریک تھے۔ ابتدا میں رئیس احمد داود صاحب احمد متعلم درجہ نہم نے ایک سپاسنامہ استقبالیہ نظم پڑھی اور بعد میں رئیس احمد داود صاحب احسن، ولیاقت علی و رضوان علی متعلم درجہ نہم و حسن منصور عباس نے غالب کی مختلف نظمیں پڑھیں۔ حسن منصور عباس نے غالب کی کہانی غالب کی زبانی سنائی۔ مسرور احمد متعلم درجہ نہم نے غالب سے متعلق وہ ملفوظات پیش کیے غالب کی زندگی سے متعلق شہاب الدین محمد رضوان، لیاقت علی متعلم درجہ نہم و ریاض احمد، خالد انور متعلم درجہ ہفتم نے ایک ڈرامہ پیش کیا۔ کالج اسٹاف کے دو معزز رکن جناب ڈاکٹر بے شنکر، جے دیال سورندر کمار سنگھ صاحبان نے غالب کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق مختلف مثالیں تاریخ کی روشنی میں دیتے ہوئے پر مغز تقریر کی۔ جناب سورندر کمار سنگھ صاحب نے غالب کی خدمت میں اپنی عقیدت کا اظہار اپنی ایک نظم پیش کرتے ہوئے کیا۔ اس کے بعد جناب بابو شیو ناتھ پرشاد صاحب لیکچرار ڈی۔ اے۔ وی کالج بنارس نے غالب کی زندگی ان کی ادبی خدمات پر تاریخ روشنی ڈالی۔ آخر میں مولانا احمد کرم افضل جیند مولوی کالج نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عوام سے اردو زبان سے متعلق دلچسپی لینے کی اپیل کی۔ (دانار حلی جوائنٹ سکریٹری)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسین نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا